نرگس مستانہ

ایک مختصر زمینی کتاب

تحریر: صادقہ نصیر

انتساب

"حیرانی کے نام"

پیش لفظ

زندگی نے ہمیشہ ایک عجیب سے مکالمے میں مصروف رکھا۔ اس مکالمے سے میرا رومانس رہا ہے۔

یہ مکالمہ لمحہ بہ لمحہ مجھے ٹرانسفارمیشن کی طرف لے کر چلتا رہا۔ یہ ٹرانسفارمیشن نہ بھی ہوتی تو بھی زندگی تو چلتی رہتی لیکن شاید مجھے حقیقی حیات نہ ملتی۔ یہ میری روح کی ہجرت تھی۔

اس مکالمے کا آغاز میری حیرانیوں سے ہوا جن سے سوال اور اعتراض ابھرتے تھے۔ یہ سوال زیر لب بڑبڑاہٹوں میں سرزد ہوتے تھے۔ ہر جاندار کی طرح مجھے اپنی بقا کی جنگ کرنی تھی۔ مگر جس طبعی ماحول میں میرا طبعی وجود پیدا ہوا میری روح شاید اس میں زندہ نہ رہتی۔ مجھے شاید ہزاروں سال اپنی بے نوری پر رونا پڑتا اور کوئی دیدہ ور نہ ہوتا۔

کیا اپنے آپ سے پیار کرنا برا ہے؟

ہاں یہ نرگسیت کا وطیرہ ہے۔ لیکن شعور کے تابع رہ کر یہ ایک مثبت قوت بن سکتی ہے۔

میں نے یہ جان لیا تھا کہ پہلے مجھے اپنے آپ سے پیار کا سلیقہ آنا چاہئے۔ اس سلیقے سے ہی دوسروں سے پیار کے سوتے پھٹتے ہیں۔

دراصل انسان دوستی کی سائنس اپنی ذات کے مشاہدے سے شروع ہوتی ہے۔ اپنی ذات کا جب تک ادراک نہیں تب تک کوئی دوسرے کی ذات میں نہیں جھانک سکتا۔ ایک مسیحا جو اپنی بیماری سے آگاہ نہیں اور اپنی ذات کے احساس سے آگاہ نہیں وہ دوسروں کا احساس کیسے کر سکتا ہے۔ ہم دوسروں سے نفرت اس لئے کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے۔ خود سے محبت کر کے ذات اور شعور کا ارتقا اعلیٰ صفات پیدا کرتا ہے۔

اوبجیکشن مائی لارڈ

یہ سوال اور اعتراضات میرا مقدمہ ہیں۔ جن کے جواب مجھے کسی نے نہیں دیئے۔ یہ آگاہی خود ہی حاصل کی۔ میری حیران بڑبڑاہٹ ہمیشہ مدمقابل رہی۔

بولنے کے بجائے اس بڑبڑاہٹ کو دبا کر وقت کا انتظار کرتے ہوئے منافقت کا سیاہ کفن اوڑھ کر خاموش

راستوں پر خاموشی سے چلنا پڑا لیکن منزل نگاہ میں رہی۔ کئی مرتبہ اس کفن سے نجات بھی ملی لیکن زندگی میں سے منافقت نکالنے کی کوشش اس چیونٹی کی کوشش کی طرح رہی جو ہر بار گرتی اور آخر کار کامیاب ہو جاتی ہے۔

میرا یقین ہمیشہ انقلاب کے ہنگامے کی بجائے رفتہ رفتہ ہونے والی مگر درست سمت پر چل کر تبدیلی لانے پر رہا۔

لیکن روایات اور دوسروں کے شعور سے بنے مینار ڈھا کر نئی عمارت کھڑی کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن ان پہاڑوں کی کوہ کنی کی مشقتوں سے خندہ پیشانی سے پہاڑی سلسلوں سے راستے بنائے جیسے پانی پتھروں سے نکل کر جھرنا، ندی اور دریا بنتا ہے۔ اور پھر سمندر۔

حقیقت یہ ہے کے ان جھرنوں کی پھوار بڑی کیف آگیں تھی جس نے برزخ کی آگ کو سرد کر کے مجھے اپنی لاش باہر نکال کر اپنا پوسٹ مارٹم خود ہی کر کے حیات نو بخشی۔ اس گہری قبر کشائی کے ہر لمحے میں میرے شعور کی شمع جل کر اجالا کرتی رہی۔

آئس کریم کا فلسفہ

پہلا گیان آئس کریم کھاتے وقت ملا جب حیرانی بڑبڑائی کہ

زندگی اور آئس کریم میں کوئی فرق نہیں کتنا بھی بڑا سکوپ ہو آخر کو پگھل ہی جاتا ہے۔ ایک ہوائی سا پانی حلق میں ایسے تحلیل ہوتا ہے کہ جیسے کچھ بھی نہیں۔ شاید آئس کریم کو بھی نہیں معلوم کہ پگھلنا اس کی موت ہے جیسے سانس بدن سے نکل کر موت کہلاتا ہے اور روح کو بھی نہیں معلوم کہ اس کو کہاں جانا ہے۔

زندگی کے الھڑ پن میں ایک دن حریصوں کی طرح آئس کریم کھاتے ہوئے میری حیرانی نے چونکا دیا؛

وہ بڑبڑائی: "اس سے پہلے کہ تمہاری زندگی ختم ہو سب کچھ بتا دو اور تاریخ رقم کرو۔ شاید تمہارا کوئی ایک لفظ اگلی نسل کی فکر کا دھارا بدل دے۔ یہ تمہارا احسان ہو گا۔ کیونکہ اگر تم کچھ کہے بغیر ختم ہو گئیں تو تمہارے پیدا ہونے کا کوئی نشان نہ رہے گا اور بقا کی جنگ ہار جاؤ گی"

میں نے جونہی آئسکریم کی پھیکی بدذائقہ سٹک قریب بنی کیاری میں پھینکی حیرانی نے مجھے پورے یقین سے دھمکی دی۔ میں نے پھینکی ہوئی سٹک کو پلٹ کر دیکھا اور خوف سے جھرجھری لی اور پھیکی سٹک پر میری نظر جیسے جم گئی ہو۔

مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے بھی اسی طرح مٹی میں پھینکا جائے گا۔

میں نے دیکھا کہ آئس کریم کی سٹک پر ابھی ذرا سا رنگ اور شیرہ لگا تھا جس پر چیونٹیاں آ گئی تھیں اور سٹک نظر آنا بند ہو گئی۔ چیونٹیاں سٹک کی کھردری درزوں میں گھس کر باقی ماندہ مٹھاس چاٹ گئیں تھیں۔

یعنی "زندگی ایبسرڈ ہے"

"بے معنی"

لیکن یہ طے کر لیا کہ بے معنی زندگی کو بھی جینا ہے۔ رو کر یا گنگنا کر۔ میں نے گنگناتے مقصد کو ہی ترجیح دی۔ زندگی المیہ اور طربیہ گنگناہٹ ہے۔

انسان کب پیدا ہوتا ہے

میری بڑبڑاہٹ نے مجھے یوں سمجھایا کہ "کوئی بھی اس دن نہیں پیدا ہوتا جو اس کا جنم دن ہوتا ہے جب آنول سے کٹ کر خون میں لتھڑا یا ہوا صاف کر کے زندگی کے کفن میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اس کی کلائی پر اس وجود کا نام لکھ دیا جاتا ہے جس سے وہ کاٹا گیا ہے۔ یہ نام اور تاریخ لکھنے سے زندگی کی طبعی آفرینش کا تعین تو ہوتا ہو گا لیکن زندہ ہونے کا ثبوت نہیں۔ انسان کی پیدائش دراصل شعور کی پیدائش کے دن سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی جب شعور پوری مدت کا ہو اور شعور کے حمل کے دوران کوئی خون نہ بہہ نکلا ہو اور اس میں کوئی نقص نہ ہو۔ نقص شعور تو انسان کی تباہی

ہے"۔

میری پیدائش دو سال کی عمر میں ہوئی جب روشنی نظر آئی۔

روشنی وہ ہوتی ہے جب کسی کی یاد میں پہلی یادداشت آتی ہے۔ الٹا چلیں تو سب سے پہلا چہرہ، پہلا منظر، پہلی صبح اور ہر پہلی شے جس سے پہلے کچھ نہیں ہوتا اور جو بھی شے آنکھ کے جھپکے میں رہ جائے بس وہی پل جنم دن ہوتا ہے۔ یعنی جب سب کچھ سمجھ میں آجائے خواہ موت سے کچھ دیر پہلے ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے وہ لوگ جو دیر سے سمجھتے ہیں وہ کم جیتے ہیں۔

میں نے پہلی روشنی سے اب تک سارے منظر سمیٹے اور ہر منظر میری فکر اور ٹرانسفر میشن کا سفر بنا۔ جو خالص میری پیدائش تھی۔

آباواجداد

میں حیران ہوں کہ میری اینسیسٹری دو عجیب و غریب راجپوتوں کے خاندانوں کا ملاپ ہے۔ وہ سب ہندوستان کے پنجاب سے آئے تھے۔ اور ہندو دھرم کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے۔

تقسیم ہند کے زخموں سے تڑپتے یہ لوگ تقسیم سے پہلے ہندوستان کے پنجاب کے خوش حال متمول زمیندار تھے۔ تعلیم ان کا اضافی شوق تھا جس کی وجہ سے یہ روشن خیالی کی طرف بھی گامزن تھے۔ میرے ددھیال میں عورتیں پڑھ لکھ رہی تھیں۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ میرے دادا اپنے بچوں کو انگریزی سکولوں میں پڑھا رہے تھے۔ میری ایک پھوپھی میوزک سیکھتی تھیں دوسری نے دو ماسٹرز کیئے ہوئے تھے۔ تایا نے ڈاکٹریٹ کیا تھا۔ کچھ وکیل لوگ بھی تھے۔ اور زیادہ فوجی تھے۔

لیکن یہ دو خاندان اپنے پیدائشی نقائص یعنی تین کلٹوں کی رسیوں میں بندھے تھے راجپوتی، اسلام اور پھر مسلک۔ تینوں حصول طاقت کے استعارے ہیں۔

دادا بھی ترقی پسند تھے

لیکن ہندوستان سے ہجرت کے بعد سب ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ راجپوتی مزاج کے برعکس مذہب کی طرف شدت پسندی سے مائل ہو گئے۔ شاید اسلامیات کی لازمی تعلیم کو انہوں نے اپنے دکھوں کا مداوا سمجھا۔ لیکن سب بوکھلا گئے اور یہ بوکھلاہٹ مرض بن کر چمٹ گئی۔ دل ہندوستان میں، پاؤں نئی زمینوں میں اور فنون لطیفہ کی جگہ دینی خدمت نے لے لی۔ لیکن کبھی بھی خوش نہ رہ سکے جیسا وہ ہجرت سے پہلے رہتے تھے۔ سب ہی نے اپنے لطیف مزاجوں کو کچل کر بلاضرورت دین کو سروں پر مسلط کر لیا۔ شاید وہ سمجھے کہ اب اس ہجرت کے بعد ایسا کرنے میں ہی بقا ہے۔ دادا نے تو اپنا تن، من دھن اور خاندان بھی مذہب کے جنون کی نذر کر دیا۔ دادی نفیس مزاج کی اور دادا شدت پسند دیندار بن گئے اور یوں فرقہ وارانہ فسادات گھر پر ہی ہونے لگے۔

ماں باپ کی مزاجی غیر ہم آہنگی، اور دادا کا سخت مزاج اور گھر کے معاملات کی بجائے دین کے کاموں کو فوقیت دینا اور گھریلو خلفشار کی وجہ سے میرے والد کو نہ چاہتے ہوئے بھی فوج کی نوکری کرنی پڑی اور ہمیشہ ماں سے بچھڑے رہے۔ مجھے دادی کے لمس سے محرومی کی ابھی تک خلش ہے

۔

اس بائی پولر مزاجوں اور تین تہذیبوں کی کھٹی میٹھی تکونی منافقتوں کی کی شدید کھینچا تانی اور بیمار نرگسی کنٹرول نے بہت سے معصوموں کو ذہنی خلفشار میں مبتلا کر دیا اور وہ شعور کی روشنی سے بھی محروم ہو گئے۔

جیو اور جینے دو

امن کی تلاش میں میرے والد نے روایات کے کلٹش شکاری جال سے بچ کر کراچی کو مسکن بنایا۔ مذہب، فوج اور راجپوتی کلٹ کی انتہا پسندی کی روایات کو چھوڑ کر انسان دوستی، ہمدردی اور انسان کی آزادی اور سچائی کے لئے محنت کو اپنا کر راستے اور منزل کا تعین کیا۔

یہ راستہ موت کا کنواں تھا لیکن اس موت کے کنویں سے موٹر سائیکل بالآخر اوپر روشنی تک آ ہی گئی۔

اس روشنی کے سفر میں جسے زندگی کہا گیا ہر قدم پر نئے تجربات ہوئے جس سے مجھے زندگی کا اپنا سچ ملا۔ اس خالصتا اپنے سچ کی بناء پر میں نے اپنا فلسفۂ حیات قائم کیا کہ "جیو اور جینے دو"

میرا بچپن

لاہور میں پیدا ہو کر کراچی میں پلنے والی میں ایک باغی نہیں بلکہ ارتقا پسند اور انسان دوست عورت ہوں۔

میرا بچپن بہت پر امن تھا۔ بہت خوبصورت تھا۔

بڑی پر سکون محبت اور شفقت آمیز زندگی تھی۔ میرے ماں باپ محبت اور ہم آہنگی اور توازن کے ساتھ زندگی گزارتے تھے جہاں ایک دوسرے کو ہر طرح کی ذہنی، مذہبی اور شخصی آزادی تھی۔ بے جا کنٹرول اور دھونس نہیں تھی۔ دنیا دیکھنے اور سیکھنے کے آزاد مواقع تھے

بہت تھوڑے میں ہم بہت خوش تھے۔ ہم بھائی کے بغیر بہنیں گاتی گنگناتی تتلیاں تھیں۔ مجھے بہت خوشی تھی کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے ورنہ شاید وہ ہماری آزاد روش اور دوستیوں پر مشتعل ہو کر غیرت کے نام پر جرم کر بیٹھتا

بھائی کی ضرورت اس لئے بھی محسوس نہ ہوئی کہ ہمیں خود کفیل ہونا سکھا دیا گیا تھا، حصول تعلیم سے لے کر بینکنگ، روزگار، خریداری سفر، جائیداد کی خرید و فروخت سب کچھ ہمیں بنا کسی رشتے دار کی مدد کے آتا تھا۔

حصول تعلیم کے بہترین مواقع، غیر نصابی سرگرمیاں اور گھر میں خوب ہنسنے اور لہک لہک کر گانے کی مکمل اجازت تھی۔ جو شاید پیچھے چھوڑے ہوئے ہجرت زدہ ناسٹیلجک روایتی خاندان میں ممکن نہ تھی۔

ماضی سے سبق

میرے والد نے اپنے والدین کے بکھرے گھر کی کرچیوں سے سبق سیکھ کر اپنے بیوی بچوں کو بھرپور پیار دیا اور بہترین تعلیم و تربیت پر توجہ دی۔ اور ہمیں سکھایا کہ گھر کیسے ٹوٹتے ہیں اور کیسے جڑے رہتے ہیں۔ گھر کی جنگیں عالمی جنگوں سے مہلک ہوتی ہیں۔

خدا اور مذہبی دکانیں

تین سال کی عمر سے میری یادداشت میں میرے قریب ارد گرد وہ لوگ نظر آئے جو اللہ مسجد، عبادت اور اپنے مسلک کو شرک کی حد تک پوجتے اور اپنے پیشواؤں کی پرستش کرتے۔

دین کی خدمت کو ماں باپ کی خدمت اور بیوی بچوں کی ذمہ داریوں پر بھی فوقیت کا حکم تھا۔ یعنی انسانوں کو بھول جانے کا۔

یہ بات میرے لئے قابل قبول نہ تھی کہ انسانوں کو بھول کر کیوں کسی ان دیکھی شے کو یاد کیا جائے۔ مجھے اپنی ماں، باپ دادی اور اپنے بہن بھائی اور قریبی رشتہ داروں کے علاوہ کسی کو یاد کرنا اچھا نہ لگتا۔

میں نے بھی ایک طویل عرصہ اپنے خوف دور کرنے کے لئے ان دیکھے خدا کا خوف کیا اور راتوں کی عبادات اور دعاوں میں اپنی آرزوں کی تکمیل اور امتحانات میں کامیابیوں کے حصول کے لئے سجدے کئے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ نہ تو مجھے خدا سے پیار تھا اور نہ محبت۔ مجھے نہیں معلوم کہ کامیابی محنت سے ملی یا عبادت سے۔ جان توڑ محنت کے بعد عبادت کا اضافی ٹوٹکہ بھی آزمایا لیکن کام سے جی نہیں چرایا۔

میں اور میرا خدا

تشکیک کی کیفیت ہمیشہ ساتھ رہی۔ جس نے آخر کار مذہب کی دکانوں سے خدا کی شاپنگ سے انکار کر دیا۔ خدا کے ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ موخر کر دیا۔ خدا ہے یا نہیں ہے؛ اس بارے میں بحث بھی زندگی کی طرح لایعنی ہے۔ اپنے آپ کو اگنوسٹک کہلوانا پسند کروں گی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ خدا کو خریدنا نہیں ہے۔

کوئی بھی خدا کو مان سکتا ہے اس پر اعتراض نہیں ہے لیکن اس کے خوف سے دوسروں کو ڈرا کر کاروبار چلائے یہ مجھے منظور نہیں۔ خدا سے وہ ڈراتے ہیں جو خود خدا سے نہیں ڈرتے بلکہ خدا کو استعمال کرتے ہیں۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا کا وجود خود انسانوں نے بنا کر ڈرے ہوئے کمتر شعور رکھنے والے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ ایسا خدا تھا جو نرگسیت کی اضافی اور منفی خصوصیت رکھتا ہے۔ شاید یہ بھی خدا کا ایک نام ہو۔ جو صرف اپنی تعریف کا شوق رکھتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو پسند کرتا ہے۔

خدا ابھی مکمل نہیں

خدا کا ارتقاء تب مکمل ہو گا جب ہر انسان شعوری ارتقا کے عروج کی منازل طے کر لے گا اور نرم روح اور محبت جنم لے گی۔ جبکہ طاقتور کا خدا جو دکان سے ملتا ہے وہ قہار ہے اور طاقتور کے قبضے میں ہے اسی لئے ابھی شاید جنگ و جدل ہی رہے گی۔

شاید خدا کے تمام نام بھی انسانوں نے رکھے اور طاقتوروں نے قہاریت، جباریت، ملکیت، ربوبیت، رزاقی، بے نیازی اور خالق ہونا اپنا لیا۔

اور کمزروں نے غفوریت، رحمانیت، عاجزی، ودودیت، شکر اور جہد کے وصف۔

فطرت کی دھاندلیاں

خدا کا ارتقا مکمل ہوتا تو کائنات میں بکھری دھاندلیاں نہ ہوتیں۔ پیدائشی معذور بچے، سائیکو پیتھ، بھیڑیئے مرد اور ناگن عورتیں، غربت، بھوک، افلاک، یتیمی، بے بسی، تنہائی بیوگی نہ ہوتی۔ کوئی مرد بیوی کو نہ پیٹتا اور کوئی بیوی مکارانہ چالیں چل کر شوہر کو دھوکہ نہ دیتی، بہن بھائی یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک نہ کرتے۔ اولاد ماں باپ کو سیں مُرہوم میں نہ پھینکتی، ماں اپنے بچے کو کوڑے میں نہ پھینکتی، باپ بچوں کو ماں سے نہ چھینتا، ماں بچوں کو مجرم نہ بناتی۔ اور سب انسان نافع الناس ہوتے۔

زلزلے، سیلاب، طوفان صرف غریب کے گھروندے نہ توڑتے۔

یہاں تشکیکی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

منافقتیں

مجھے منافقتوں کے جال سے نکلنے کے لئے کچھوے کی چال چلنی پڑی میرے لئے یہی مناسب تھا۔ نگاہ بلند ہی رہی۔

۔میں نے ان منافقتوں پر پہلی بار زیر لب "او بجیکشن مائی لارڈ" 8 سال کی عمر میں کہا تھا جب میں والدین کے ہمراہ اپنے روحانی پیشوا سے ملاقات کے لئے گئی۔ روحانی پیشوا ایسے قالین کے اوپر رکھے صوفے پر تنہا براجمان تھے جس پر پاوں رکھیں تو گھٹنے گھٹنے تک قالین میں دھنستے تھے۔ روحانی پیشوا سفید براق لباس میں تھے۔ انہوں نے دعا کی اور میری ماں نے ایک لفافے میں سو کا نوٹ ڈال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ابا کی تنخواہ شاید 500 روپے ہو گی۔ پھر ان کے حرم کی بیگمات سے ملنا بھی شاید ایک فرض نماز تھی اور رسم مریدی تھا۔ بیگمات سنہری مسہریوں پر براجمان اور پیروکار عورتیں ہاتھ چوم چوم کر ایک طرف بیٹھتی جاتیں۔

یہ مذہب کا وہ شاپنگ مال تھا جہاں میرے والدین بھی خدا خریدنے گئے تھے۔ مگر میری آنکھوں میں وہ عیاش منظر اس طرح ٹھہر گیا تھا جیسے ناگن کی آنکھوں میں مارنے والے کی شکل یاد رہ جاتی ہے۔

میں سوچتی کہ ہم دعا خود کیوں نہیں کرتے۔

میرے لئے یہ امر معترضہ تھا کہ یہ مذہبی رہنما اور پیشوا ہماری زندگی کے ہر پہلو کو کنٹرول کریں۔ نام رکھنے سے لے کر ڈریس کوڈ، تعلیم، روزگار اور شادیوں کے فیصلے، صاحب اولاد ہونے کے معاملات بھی ان کی دعاؤں کے جھانسے کے جال میں ہوتے۔ ان پیشواؤں نے ہماری لطیف حسیات ، رقص و موسیقی کے شوق اور مسکراہٹیں چھین لی تھیں جبکہ

ہمارے یہ سوکالڈ آقا خود لہو لعب سے گریزاں نہیں تھے۔ ان کے نیکی کے دہرے معیاروں نے مجھے ان سے دور رہنے پر مجبور کرتے۔

اس ملاقات نے مجھے عرصہ تک شک میں رکھا۔

مذہب اور نفرت

مذہب کی جنگیں تو گھر سے ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ عقیدے سے ہٹ جانے والے لوگوں کو دھتکار کر ان سے خونی سلسلے کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا

۔

اسی مذہب کے شاپنگ مال سے خریدے ہوئے خدا ایک ہی خاندان میں دو متحرب گروہ بنا دیتے ہیں جس میں ایک پارسا گروپ، دوسرا ملحد و گناہ گار اور تیسرا منافق جو دونوں کو کمک پہنچاتا ہے۔ شاید مفاد پرستی اور شاید خوف اور شاید وہ کنفیوژن کی وجہ سے۔

معصوم دیہاتی

او بجیکشن می لارڈ!

میرے شعور نے بہت چھوٹی عمر میں معصوم دیہاتیوں کو معصوم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے وہ معصوم کم چالاک اور ہٹ دھرم زیادہ لگتے تھے۔ جن دیہاتوں سے ہمارے آباء واجداد کی زمینوں کی مٹی سے ہمارے قدم لتھڑے ہوئے تھے؛ ہمیں ان زمینوں کے مالکان کے مرنے کے بعد ان زمینوں کا وارث بننا تھا ہماری نصف خوشحالی اس مٹی سے وابستہ تھی۔ بڑے شہروں میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے باوجود سہولیات چھوڑ کر سال میں ایک ماہ ان زمینوں کے حقدار ہونے کا ثبوت دینے کے لیئے ان دیہاتوں میں گزارنا ضروری تھا۔ لہلہاتے کھیت، مربعوں کی سیر، خالص خوراک اور خالص سچے معصوم لوگ بے لوث محبتیں اور جنسی پاکیزگی کے علم بردار اور سیکس پر بات کرنے کو گناہ سمجھنے والے لوگ غرض گاؤں کا

ہر منظر دلکش و پاک تھا۔ مگر ان پاکیزہ لوگوں کی منافقتیں دیکھ کر یہ صنم بھی ٹوٹا اور میں نے ان منافقتوں پر "او بجیکشن مائی لارڈ" کہہ کر ہمیشہ کے لئے گاؤں جانے سے انکار کر دیا مجھے یہ لوگ میری آزادی، تعلیم اور میری منفرد فکر اور تشخص کے قاتل لگے۔

مجھے بچپن سے ہی احساس ہو گیا تھا کہ ان کھیتوں سے جن کی سیر کو ہم جاتے ہیں یہ تازہ گندم تو پیٹ میں ڈال دیتے ہیں لیکن دماغوں سے شعور نکال کر بھوسہ بھر دیتے ہیں۔

اور اس گندم کے لالچ میں خاندانوں کے کڑیل جوان اپنی جوانی کی طاقتیں شریکوں کے ساتھ جنگ و جدل میں گزار دیتے ہیں اور زمینوں کی جائیدادوں کے وارث بننے کے انتظار میں کتاب نہیں اٹھاتے اور پھر گندم سے سیر ہو کر بے شعور نیند سوتے ہیں۔ اور بہت سے تو زمین کے چند ٹکڑوں کی خاطر اپنا وقت کچہریوں کے چکر میں گزارتے ہیں۔ لیکن غریب مزارعے دن رات سورج میں جھلتے اور سردی میں ٹھٹرتے ہیں۔ اور زمیندار گاؤں میں سکول بھی نہیں بننے دیتے۔

ان سو کالڈ سادہ اور معصوم لوگوں کی ایک منافقت یہ بھی ہے کہ یہ سادہ رہتے ہیں اور سادہ کھاتے ہیں۔ لیکن معاشی معاملات میں بڑی سفاکی سے بہن کے حصے کی زمین بھی کھا جاتے ہیں۔ جو بہن حق معاف کر دے وہ ہیروئن ہوتی ہے اور جو حق مانگ لے اس کی نسلوں کو بھی نفرت سے دیکھتے ہیں۔

دیہاتی لوگ اپنی ذات پات کو مذہب پر فوقیت دیتے ہیں لیکن جب زمین کا معاملہ ہوتا ہے دادا شریعت کا چولہ پہن کر اپنے زندگی میں مر جانے والے بیٹے کی کمائی ہوئی جائداد پر اپنے حق کا دعوی دائر کر دیتا ہے اور اپنے ہی یتیم پوتے پوتیوں کا مال شریعت کے نام سے وصول کر لیتا ہے۔

می لارڈ! یہ کیسی معصومیت ہے کہ نرینہ اولاد سے محروم بیٹے / بھائی کی بیٹیوں کو حق جائداد سے محروم کر دیا جائے۔

می لارڈ! یہ سب معصوم لوگ شریعت کو بھی حسب ذائقہ اور ضرورت استعمال کرتے ہیں۔

یہ زمینوں کے ٹکڑے شعور ہی نہیں محبتوں کی بھی قینچیاں ہیں جس سے سگے رشتے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں۔

جنسی پاکیزگی کی منافقتیں اور معصوم دیہاتی

میں نے اپنے ننھے ذہن کی بصیرتوں سے گنے کے کھیتوں میں سے رنگین سرسراتے آنچلوں کے ساتھ مردانہ سرگوشیاں سنی تھیں اور سکیس ایجوکیشن کے انتہائی چالاک ابلاغ کے مناظر دیکھے۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ باتیں جو ہم بڑے شہروں میں رہ کر بھی نہ جان سکتے تھے وہ دیہاتوں کی ہر سات سالہ لڑکی کو علم ہوتیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی ننھی بچیاں ہمہ وقت اپنی ماؤں، بہنوں اور خاندان کی عورتوں کو بلوغت کے مسائل، گزشتہ رات کی سیکس کی کہانیاں، ہسٹیریا کی وجوہات اور عورت کی چال دیکھ کر اس کے حمل کو پہلے ہفتے میں ہی پہچان جانے والی کنواریاں بھی کھل کر بولتی ہیں۔

وہاں کی ہر عورت جانتی ہے کہ خفیہ طریقے سے حمل ضائع کرنے کا کونسا گھریلو نسخہ ہے۔ میرے لئے اس لئے قابل اعتراض تھے کے یہ لوگ شہروں میں پڑھنے والی لڑکیوں کو گمراہ سمجھتے تھے۔ گاؤں کے بہت سے مردوں کے مزارعوں کی عورتوں سے ناجائز تعلقات بھی تھے جن کو کلٹش برادری کے بزرگ جن کی اپنی جوانیاں بھی رنگین گزریں کمال ہوشیاری سے چھپا لیتے۔

عورتوں کو ارادتا تعلیم سے محروم رکھا جاتا۔ کھیل کود، مسکرانا، کھکھلانا، گانا، گنگنانا اور رقص و موسیقی ان کے لئے حرام تھی جبکہ مرد یہ سب کر سکتے تھے۔

ایسا نہیں ہے کہ ان پاکیزہ دیہاتوں میں صرف عورت کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ یہاں مرد بھی سہل پسندی اور جائداد سے عاق ہونے کے خوف سے دبے رہتے ہیں۔ یہاں صرف کلٹش خاندان کا رنگین مزاج عمر رسیدہ مرد جو طاقتور ہے شرافت کے لبادے میں تمام دوسرے مرد عورتوں کی

زندگیوں کے فیصلے کرتا ہے اور نوجوان مرد اور عورتوں کے ذہنوں کو جنسی شرافت کے جعلی ملبوسات پہنا کر جمود کا شکار کر دیتا ہے۔
مجھے اس کلٹش خدائی کی غیر منصفانہ شرافت کی تعریف پر اعتراض تھا۔ جس میں جنسی پاکیزگی کی حفاظت کا فریضہ صرف عورت کے حصے میں آیا۔ جبکہ حقیقت یہ کہ وہ بھی کمال ہوشیاری سے اپنے معاملات سنوارتی دکھائی دی۔
میں نے احتجاج کیا اور کامیاب رہی۔ لیکن ایک مرد یعنی اپنے والد کو ہمنوا پایا۔
میرے والدین نے تو بہت پہلے ہی آبائی زمینوں سے تکیہ اٹھالیا تھا اور گندم کے کھیتوں سے اٹھتی روایات کی گرد کو جھاڑا اور پر امید ہو کر ہجرت کی اور کشتیاں جلاڈالیں اور علم، آزادی، محنت اور مشقت کا راستہ اپنایا تو ایک الگ زندگی ملی جس میں لاتعداد من چاہی چوائسز تھیں۔ اور یہ جانا کہ زندگی میں جتنی چوائسز ہوں گی اتنی دیر تک زندگی کی آئس کریم مزہ دیتی رہے گی۔
آج میں اپنے روایت زدہ اور سہل پسند خاندانوں کے جمود کو توڑنے اور جھنجھوڑنے کا استعارہ اور شمع فروزاں ہوں۔

دعا، پرائز بانڈ اور ٹیوشن

یہ تین استعارے ہیں جو میری زندگی کے دردناک دور کی شاعری میں استعمال ہوئے۔ ہمارے باپ کی کینسر کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ زندگی بچانے کے ساتھ روٹی اور مکان اور عزت سب کچھ بچانا تھا۔
دن رات دعائیں، علاج، اور جمع شدہ پرائز بانڈ ہر مرتبہ امید دلاتے اور پھر مایوسی میں دھکیل دیتے۔ لیکن پھر بھی ان نسخوں کو استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔
اچانک زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے ٹیوشن نے امید و یاس کی اذیت سے نکالا۔
حسن اتفاق سے کبھی دعا قبول ہونے اور پرائز بانڈ نکلنے کے معجزے خیالی قلعے بنانے کا خبط پیدا کر کے جمود کا باعث بنتے۔ اور دعا قبول نہ ہوتی اور پرائز بانڈ نہ نکلتے تو زندگی موت بن جاتی تھی لیکن
میں نے تتلی سے فالکن کی ٹرانسفارمیشن اختیار کی اور رنگین پروں کی خوبصورتی کو بچاتے ہوئے حصول علم کے ساتھ ٹیوشن کی مشقت کو زندگی کرنے کا فن بنالیا۔ اور عورت کی ایمپاورمنٹ کا جھنڈا گاڑ دیا۔
اب ہر ٹیوشن پر یقین کے ساتھ رزق کے اسباب ہاتھ میں وعدے کے مطابق گرنے لگے۔
تب یہ جانا کہ انسان کو کامیابی کے ساتھ زندگی کرنے کے لئے پرائز بانڈ کی امیدیں توڑتی لاٹری اور دعاوں کے معجزوں اور منتروں سے نہیں بلکہ زمین پر کی گئی محنت سے اور زمین پر اگے ہوئے پہاڑوں کو کھودنا پڑتا ہے۔ اور یوں زندگی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اور اسی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی آزادی کا راز ہے۔
لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں ابھی بے خوف ہوں۔ اور خدا کو نہیں پکارتی۔ یہ خدا خالصتا میرا ہے۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ یہ میرے ہی اندر کی قوت ہے۔ اور دعا کا مطلب اس قوت کو متحرک رکھنا ہے جو میں خود ہوں۔ دعا ایک خود کلامی ہے جس سے خود کو باور کرانا اور مقصد کی طرف متوجہ رہنا ہوتا۔
لیکن اس قوت کو منظم مذاہب کے لیڈروں کے ہاتھوں میں دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ غریب کو جہاں روٹی نہیں ملتی وہاں اپنے کتھارسس کے لئے خدا بھی مفت نہیں ملتا۔ اور بے وقوف لوگ ان انسانوں کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔

مذہب اور روحانیت

میں نے مذہب اور روحانیت کے فرق کو سمجھا۔ مذہب استحصال ہے اور روحانیت دل کی روشنی جہاں شفاف اور نرم کرنیں راستہ دکھاتی ہیں۔ یہ نرم کرنیں محبت، سچائی، ہمدردی، دیانت داری اور فطرت کے اصولوں کو لے کر چلتی ہیں اور ضمیر جیسی اعلی ذہنی سطح پر براجمان رہتی ہیں۔ ضمیر انسان کے اندر ایک ایسی دھیمی اور واضح آواز ہے جس کو خدا کہا جاسکتا ہے۔ اس آواز کو سننا خدا کو پانا ہے۔ خدا اپنے ہی شعور کی شمع کو پکڑنا ہے۔

گھنٹی میں اٹکے لوگ

میں خود بھی شاید ذہانت کی پیمائشوں پر اعلی مقام نہیں رکھتی تھی۔ مگر میرا شعور مجھے درمیانی درجے پر لٹکنے سے باز رکھتا تھا۔ میں ٹرینڈی نہیں ٹرینڈ سیٹر بننا پسند کرتی ہوں۔

مردے اور زندے

مردے کے ماتھے پر بوسہ کیوں دیا جائے جبکہ زندگی میں بوسے ممنوع ہوں۔
موت کے بعد قیمتی تابوت اور قبر کے لئے پلاٹ کیوں خریدا جائے جبکہ کسی نے تمام زندگی بے گھری میں گزاری ہو؟۔
موت کے بعد بخشش کی دعائیں اور زندگی میں ایذا رسانیاں کیوں؟ اور معافیاں کیوں نہیں؟
می لارڈ! یہ انسانی تہذیب کی مضحکہ خیزیاں نہیں تو اور کیا ہیں؟
مرنے والے پر رونے کی رسم اور اس کے پیچھے زندہ بچ جانے والوں کی دادرسی سے پہلو تہی کیوں؟
قبروں پر پھول اور زندہ کی راہ میں کانٹے؟
دوا اور خوراک میں ملاوٹ کرنے والے کو گناہ گار نہیں کہا جاتا جب کہ مرد عورت کی آزاد محبت کو گناہ کبیرہ سمجھنا بھی تو مضحکہ خیزی ہے۔

ہجرت

ہجرت ہمیشہ ایک خوشگوار ارتقائی سانحہ ہوتا ہے۔
ہجرت خواہ جبری ہو، معاشی، سیاسی یا کوئی آکسوڈس یا کسی بھی وجہ سے؛ اس کو تسلیم کر کے اگر بخوشی گلے لگا لیا جائے تو یہ ارتقا کا ذریعہ ہے۔ اپنے آپ کو ہمیشہ مہاجر کہلوانا، ہجرت زدہ بن کر منہ بسورنا، سالہا سال نئی ہجری سرزمین میں آکر بھی وطن کی مٹی کی خوشبو کو یاد کرنا نا سٹیلجیا کی بیماری ہے۔ سالہا سال اپنے بیک ہوم کی تعریفیں کر کے اپنے بچوں کو شرمندہ کرنا اپنی خجالت مٹانا ہے۔ اور دو کشتیوں میں سوار رہنا میرے نزدیک منافقت ہے۔
کرہ ارض کی ہر جگہ وطن کہلوانے کی مستحق ہے جہاں روزی کے ساتھ شعور بھی ملتا ہو۔
میں نے بھی سنہری مواقع کی سرزمینوں کو تلاش کیا اور ہجرت کی
یہاں پر بھی یہ فلسفہ کام آیا کہ جب زندگی کی آئس کریم نے پگھلنا ہی ہے تو اپنی چوائس کی جگہ رہنا چاہئے اور اپنی پھیکی سٹک کو بھی وہیں پھینک دینا چاہئے۔ انسان کی کی جنم بھومی ایک ہی ہے اور وہ ہے "مٹی"۔ مٹی میں ملنا ہے تو یہ مٹی یا وہ مٹی۔

اسی فلسفے نے آئسکریم کو کافی دیر تک پگھلنے سے بچائے رکھا۔

حل شدہ پرچہ جات

کٹھن حالات جو موت کا چہرہ بھی دکھا دیتے ہیں اس بات پر آمادہ رکھا کہ جب تک آئس کریم تحلیل نہیں ہو جاتی ہمیں اچھے ذائقے کی امید میں اسے چاٹتے رہنا ہے اور تحلیل ہو جانے سے پہلے فطرت کی دھاندلیوں کو امتحان سمجھ کر ان کو حل کرنا ہے۔

ان دھاندلیوں کے امتحان کے لئے کوئی حل شدہ پرچہ جات نہیں ملتے۔ ہر انسان کے امتحان میں الگ سوالنامے ہیں اور ان امتحانوں میں کامیاب ہونے کے لئے کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ ہر امتحان میں نتیجے کو انسان اپنے وجود اور روح کے خون سینچتا ہے۔

انسان اپنی آئس کریم سے اپنے آخری ذائقے کو خوشگوار مٹھاس میں بدل سکتا ہے یہی انجام بخیر ہے اس پر ہی آخرت کا گمان کرنا چاہئے۔ مابعد الموت کچھ بھی نہیں اگر ہے تو ہمیں صرف آج کو پکڑنا ہے۔ جس میں زندہ انسان بستے ہیں۔

عورت مرد کا جھگڑا

تہذیب تیزی سے رخ بدل رہی ہے۔ اب شاید مرد عورت کا جھگڑا ختم ہونے کو ہے کیونکہ عورت ہی ختم ہو رہی ہے۔ یا پھر غلط سمت میں اپنے حق مانگتی عورت بہت پیچھے رہ جائے گی۔

میری حیرتوں کی انتہا ہوتی ہے جب عورت اور مرد کا قصہ یوں بیان ہوتا ہے جیسے یہ جنگ ہو۔ میں فیمنزم اور میل شاونزم کے الفاظ سے محبت نہیں کر سکتی کہ یہ تعصب ہے۔ میں مرد سے تعصب نہیں کر سکتی۔ فطرت کی بہت سی دھاندلیوں میں سے یہ دو ضدین بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دھاندلی ہو۔ لیکن یہ دو انسان فطرت کا اپنا معاشقہ ہیں۔ انسانی معاشرے کی ہر جنگ کسی ناانصافی یا کسی بھی معاملے میں توازن کے بگڑنے کے نتیجے میں عمل میں آتی ہے۔

او بجیکشن مائی لارڈ!

انسانوں کے شعور کے نقائص نے انسان کو اتنا بے بس بنا دیا کہ انسان فطرت کی دو ضدین اور انتہاؤں میں توازن کھو بیٹھا ہے۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کی تکمیل ہیں اس تکمیل کے لئے برتری اور کمتری کا تصور کیسا؟۔ طاقت اور غلبے کی خواہش کیسی؟

طاقت اور غلبے کی جنگ میں عورت اور مرد اپنی ہی تکمیل بھول گئے۔

مرد کی جسمانی طاقت نے اسے جانور بنا دیا اور صدیوں عورت کا استحصال کیا۔ عورت اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کو ختم کرنے کی جنگ میں رد عمل کے طور پر کسی اور سمت نکل گئی۔ وہ اپنی عزت کروانے اور مرد کی طرف سے کئے جانے والے جسمانی اور جذباتی طوفان کو روکنے کی حکمت عملی اپنانے کے بجائے عورت کے غلبے اور دنیا پر حکمرانی کی جنگ میں مصروف ہو گئی۔ اور

پہلے نسوانی حسن کھو بیٹھی پھر جسم اور پھر گھر بار، اولاد اور خاندان سب کھو بیٹھی۔ یہ عورت پر ظلم کا ایک اور انداز ہے۔

عورت کے حقوق

میرے حقوق وہی تھے جو مرد کے یعنی انسانی حقوق۔ وہ حقوق کسی نے مجھ سے نہیں چھینے تھے مجھے ہی شعور نہ تھا کہ اپنی چیز کو سنبھال کر رکھتے ہیں

۔

میں یہ جانتی ہوں کہ عورت کے یہ حقوق اس لئے چوری ہوگئے کہ وہ بھی عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ لیکن عورت کو ہی بیٹھ کر کھانے کا، اور اس مرد سے شادی کرنے کا شوق تھا جو اس کو مہارانی بنا کر بٹھائے۔ می لارڈ! جب مہارانی بن کر آنکھیں موند کر عیاشی کرنے کا شوق ہو تو راجدھانیاں لٹ جاتی ہیں۔ عورت نے اپنی سہل پسندی اور حقیقت سے نظر چرائی تو اس کا سب کچھ لٹ گیا
می لارڈ!

میں ایک کامیاب عورت ہوں

عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھانے والی اور آزادی کی علمبردار اور مکمل طور پر امپاورڈ عورت۔
عورت کی ایمپاورمینٹ کا آغاز اس بات سے ہی ممکن ہے کہ عورت پہلے اپنے عورت ہونے پر اعتماد سے فخر کرے اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ انصاف کرے۔
مجھے اپنے عورت ہونے پر ناز ہے
میں نے اپنے عورت ہونے پر کبھی ماتم نہیں کیا کیونکہ
میں کائنات کی خوبصورت ترین مخلوق ہوں۔ یہ اعتماد میری طاقت ہے۔ میں تخلیق کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ میں مرد کو جنم دے سکتی ہوں اور مرد کی تربیت پر میری حکومت ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے نہ کہ احساس کمتری کیونکہ دنیا کی حکمرانی پر بیٹھے میرے ہی پیدا کیئے مرد ہیں۔
میں نے عورت اور مرد کی محبت اور قربت کے وسیلہ محبت کو سمجھا۔ شہوانیت اور دائمی محبت کے فرق کو سمجھا۔ اپنے جسم کو روح کی پر نور لطافتوں سے آراستہ رکھا۔
میں نے پہاڑوں کے پتھروں سے راستہ بنایا اور سمندر بنی۔
میں نے روایات کو چھوڑا مگر روایات کے جمالیاتی پہلو کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کی
۔انسانی حقوق کی پامالی نہیں کی۔

میں آزادی کی دلدادہ تھی۔ مجھے شوق تھا کہ میں اپنے رنگین پروں کے ساتھ ہی پرواز بھروں اور کوئی مجھے پکڑ کر میرے پروں کو مسل کر میرے رنگ نہ چھینے۔ ایسا ہونا بہت مشکل تھا لیکن ایسا کرنا ناممکن بھی نہ تھا۔
میں نے اپنے شعور کی ارتقائی پرواز کے لئے آزادی حاصل کی نہ کہ اپنے فطری رول کی ذمہ داریوں سے انحراف کے لئے۔

مجھے حکومت کی خواہش تھی مگر اس کے لئے مجھے مرد کی حکومت پر شبخون مارنے کی ضرورت نہیں پڑی۔
مجھے مرد سے کبھی ڈر نہیں لگا اور نہ ہی مرد کو ڈرانے کی ضرورت پڑی کیونکہ مجھے مرد سے نہ حسد تھا نہ مقابلہ۔
می لارڈ ایک سمارٹ عورت ہی حکمرانی کر سکتی ہے۔

ایک سمارٹ عورت ہونے کی وجہ سے مجھے ادراک تھا کہ پوری دنیا تبھی میری راجدھانی بن سکتی ہے جب میرے ہاتھ میں میرے اپنے گھر کی سلطنت کا قلمدان ہو گا۔

یہ قلم دان میں نے "توے" سے حاصل کیا تھا۔ روٹی بنانا نہیں چھوڑی۔ مجھے ادراک تھا کہ اگر "زن" سے "توا" جدا کر دیا جائے تو "توازن" کھو جاتا ہے۔

روٹی کے فن کی کرشمہ سازیاں

دراصل مجھے روٹی بنانا فنون لطیفہ کی ایک صنف لگتی تھی جیسے کسی کالج آف فائن آرٹس کے دلربا لڑکے اور لڑکیاں مجسمہ سازی میں مصروف ہوں ۔روٹی میرا فن پارہ اور اس کو بنانے کا عمل تھیراپی ہے۔ روٹی بناتے ہوئے میں ہمیشہ زیر لب مسکراتی اور جب میرے خاندان کی سلطنت کے لوگ میری فن کاری سے بنی روٹی کھاتے تو مجھے اپنے روٹی سازی کے فن سے ایک طمانیت ملتی۔ تب مجھے اپنی نوجوانی کی حماقت پر شرمندگی ہوتی کہ آزادی نسواں کے بے فائدہ نعروں میں میں نے بھی روٹی پکانے پر احتجاج کیا تھا۔ لیکن شادی کے بعد میں نے اس فنون لطیفہ کی مجسمہ سازی میں اپنے جیون ساتھی مرد کو بھی شامل کر لیا۔ جیسے کمہار اور کمہارن مل کر مٹی گوندھتے اور چاک پر رکھ کر کوزہ گری کرتے ہیں یا نیشنل کالج آف آرٹس کے فیشن ایبل لڑکے لڑکیاں مجسمے بناتے وقت ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

مل کر روٹی کمانا اور انہماک اور لگن سے روٹی پکانے کے عمل کو رومانس ہی سمجھا۔ گھر کے چولھے کی آگ کو مقدس آگ سمجھ کر جلائے رکھا۔ جیسے کسی زرتشت گھرانے میں گھر کے مرکز میں آگ کا مقدس شعلہ تازہ بہ تازہ جلتا ہے۔ جس نے خاندان کی رعایا کے دلوں کو محبت کی آگ سے گرمائے رکھا۔

یہ روٹی کا فن پارا پورا خاندان کھاتا اور بھوک مٹاتا۔ مجھے اپنی روٹی سازی کے فن پر فخر ہے کیونکہ پیٹ کی بھوک مٹائے بغیر انسانی ہمدردی کا دعوی ہی نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی عورت کتنی بے وقوف ہے کہ وہ گھر کے توے پر روٹی پکانے کو تھکا دینے والا عمل اور گھنٹوں لائن میں کھڑے ہو کر فاسٹ فوڈ خریدنے کو آسان سمجھتی ہے۔

می لارڈ! میں تہذیب کے اس موڑ پر کھڑی ہوں جب انسانی تہذیب کا ادارہ "خاندان" چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہا ہے۔

جس میں مرد اور عورت برابر کے ذمہ دار ہیں اور اب سائنسی ارتقاء اس تجربے کو کسی نئی کسوٹی پر پرکھے گا۔ کیونکہ عورت نے مرد کو قانون کی آڑ میں ہراساں کرنا شروع کر دیا ہے۔ شاید اب اس کا نام کمزوری نہیں رہا۔ طاقت ایک بار پھر سے شدت سے دوسرے پلڑے میں آن گری ہے۔ ورکنگ وومین نے اکنامک ایمپاورمینٹ کے ذریعہ دنیا کی تہذیب کا نقشہ بدل دیا ہے۔ لیکن آج کی عورت نے اپنی رنگین پروں، رومانس اور نسوانیت کو فاسٹ فوڈ اور شاپنگ کے بھونڈے پن کی نذر کر دیا ہے۔ وہ پروڈیوسر کے بجائے کنزیومر زیادہ ہے۔

بچے انسانی نسل کی بقا ہیں

عورت کو میں مرد سے برتر سمجھتی ہوں کیوں کہ وہ تخلیق کرتی ہے۔ اس تخلیقی عمل کا حسین احساس تفاخر عورت کو اعتماد بخشتا ہے جو خدا کے درجے پر فائز کرتا ہے

۔ لیکن اس عمل کو دو انسان مل کر تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

صدیوں تک المیہ یہ رہا کہ مرد عورت کو اپنی کھیتی کہتا رہا اور پیداوار یعنی بچے کنٹرول کر کے ممتا کو تڑپاتا رہا۔ لیکن اب جدید تہذیب میں عورت کی

ایمپاورمنٹ میں عورت نے سفاک بن کر بچے کنٹرول کر لئے ہیں۔ اس کنٹرول کی خواہش نے عورت کی ممتا کو حکمرانی کی سفاکیت میں بدل گئی ہے جو میرے نزدیک خوشگوار نہیں ہے۔

می لارڈ! اس کشمکش میں مرد عورت اپنے محبتوں کے دعوے بھول کر رقابت کی آگ میں جلنے لگے۔

جبکہ عورت ہونے کے ناطے مجھے یہ عدم تحفظ نہیں ہوا کہ میرے بچے کو اس کا باپ چھین لے گا اور نہ ہی یہ سفاکیت میں نے اپنائی۔ میں نے عورت ہونے کے باوجود مرد کے جوتے پہن کر اس کے پدری جذبات کو سمجھا۔

میں نے یہ راز پالیا تھا کہ باپ کے بغیر بچہ بلبلا سکتا ہے۔ اور بلبلاتے بچے مجھ سے نہیں دیکھے جاتے۔ جب بچے بلبلاتے ہیں تو انسانیت بلبلاتی ہے۔

میں انسان دوست ہوں انسانیت کو کیوں رلاؤں۔ یہ پیغام مرد کے لئے بھی یکساں نفوذ کا متقاضی ہے۔

بچے زمانے کی امانت ہیں۔ جنہیں نافع الناس بنا کر زمانہ سازی کرنی ہے۔ اس امانت میں خیانت ایک بھیانک جرم ہے جو جنسی بے وفائی سے زیادہ قابل تعزیر ہے۔

خاندان کا ٹوٹ جانا ایک بچے کے ساتھ سب سے بڑا جذباتی تشدد ہے۔

یہ تشدد وہاں رونما ہوتا ہے جہاں برے والدین بچوں کے سر پر ہوں۔

ایک عورت مرد کے ساتھ دوست بن کر ہنستے مسکراتے بچے تیار کر کے دنیا پر حکمرانی کر سکتی ہے

می لارڈ! اس مقام پر عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔

مرد سے میری محبت کئی ادوار سے گزری۔

پہلے ایک مرد سے، پھر شوہر سے پھر اپنے بچے کے باپ سے اور اب اپنے جیون ساتھی سے۔ ہر دور کی محبت کا الگ رومانس ہے۔ بڑھاپا زندگی کا حسین ترین دور ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کا پر امید ہو کر انتظار کیا۔

مرد عورت جانور کیوں؟

مرد عورت کے تعلقات میں دو اچھے بھلے انسان جانور کیوں بن جاتے ہیں۔ ان کی فطرتوں کی لطافت کشش اور محبت کی نرمی حسد میں ڈھل کر انہیں جانور کیوں بنا ڈالتی ہے۔ اگر فطرت نے یہ دو انسان ایک دوسرے کی تکمیل کے لئے بنائے ہیں تو مرد بھیڑیا اور عورت ناگن کیوں بن جاتی ہے۔

اگر مرد کا بھیڑیا اور عورت کا ناگن پن ختم کر دیا جائے اور دونوں اپنی شعوری روشنی سے انسان بنے رہیں دونوں ایک دوسرے کو انسان سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کی جذباتی اور جسمانی کمزوریوں کا احترام کریں تو عورت اور مرد کے حقوق کی جنگ جنم لے ہی نہیں سکتی۔

وہ اپنے گھر کی سلطنت میں اپنے رول نبھا کر اور جیون ساتھی کو مخلص دوست بنا کر بھی باہر کی دنیا میں سر اٹھا کر چل سکتی ہے۔ بشرطیکہ گھر ترجیح ہو

۔

می لارڈ! میں جانتی ہوں کہ عورت کا عرصۂ مظلومیت بہت طویل رہا ہے۔ اس کو آزادی چاہئے تھی اور آزادی چاہئے ہے۔

معاش کی آزادی، حق ملکیت، علم اور آگاہی کی آزادی، محبت کی آزادی، عشق اور مردوں سے دوستی کی آزادی، شریک حیات چننے کی آزادی۔ عورت اور مرد کی برابری میں عورت اور مرد کی شرافت کے معیار بھی یکساں ہوں۔ اور جنسی پاکیزگی کو شرافت سے جوڑ کر عورت کا استحصال نہ ہو

۔

آج کی عورت کے اپنے حقوق کی جنگ پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن توازن کھو کر عورت ایک بار پھر جنگ ہار رہی ہے۔

ماضی کے انتقام کیوں

عورت نے عرصۂ دراز کے ظلم سہنے کے بعد حقوق مل جانے کے باوجود پرانے مرد کا وطیرہ اپنالیا ہے جو عدم توازن کا راستہ ہے جس کی وجہ سے خاندان ختم ہو رہے ہیں۔

او بجیکشن مائی لارڈ کیا عورت نے دنیا فتح کر لی؟

نہیں اس نے تو اپنے کچن کی سلطنت بھی کھو دی۔

معکوسیت

آج کی عورت نے بے شک اپنی آزادی کے حصول کے لئے جو رویئے اپنائے ہیں وہ دراصل مردوں کے ان رویّوں کا رد عمل ہیں جن کو ان جدید عورتوں کی ماؤں نے جھیلے۔ یعنی کوئی عورت مردوں سے اس لئے متنفر ہوئی کیونکہ اس کی ماں کے ساتھ اس کے باپ نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ اپنے باپ کو تو نہیں سدھار سکی لیکن اس کے نتیجے میں وہ شوہر سے مشکوک رہتی ہے اور حقوق نسواں کے پاسدار قوانین کو کبھی یا اکثر محض خدشات کی بنا پر استعمال کرتی ہے جبکہ اس کی ضرورت بھی نہ ہو۔ اور یوں آج کی عورت نے اپنی رومانوی اور ازدواجی زندگی کو محض اپنی ماں کے بھولے بسرے روندے ہوئے حقوق کی خاطر قربان کر کے اپنی لی ہوئی آزادی کو بے مقصد لڑائی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

مرد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بھیڑیا صفت باپ کو جب ماں کے ساتھ ظلم کرتے دیکھا تو مرد نے بھی عورت کو نفرت کرنے کی شے سمجھا اور اپنی بیوی پر ظلم کیا اور عورت کو صرف جنسی کھلونا۔

آج کی عورت آزادی تعلیم، امپاورمنٹ اور بے پناہ مراعات کے باوجود محض بھیڑ چال میں سنگل مدر کے ٹائٹل کو تمغے کی طرح سجائے پھر رہی ہے اور مرد سے بچے چھین کر ان پر مصنوعی یتیمی مسلط کر دیتی ہے۔

آج کی تعلیم یافتہ عورت نے شدت سے نرگسی رویئے اپنا لئے ہیں اور وہ اپنی تمام تر قوت مرد سے حسد کرنے اور بچوں کو کنٹرول کرنے میں صرف کرتی ہے جبکہ اس کی ضرورت بھی نہ ہو۔

یا اگر وہ خاندان میں رہ بھی رہی ہے تو اس کا رویہ قدیم مرد جیسا ہی ہو گیا ہے۔ وہ مرد کو نہ صرف ہراساں کر کے اس کو کولہو کا بیل بناتی ہے اور "ڈو مور" کی تحریک اور اپنی اور شوہر کی کمائی کو شاپنگ کے شوق میں خرچ کر کے پروڈیوسر کی بجائے کنزیومر نظر آتی ہے۔ ساز و سامان میں گھری عورت مکان کو گھر بنانے کے مقصد سے ہٹ رہی ہے۔

می لارڈ! مجھے آزادی کی خاطر ایک بار پھر عورت کا ہی نقصان نظر آ رہا ہے۔

اس کے لمبے بال، نرگسی آنکھیں۔ نزاکت، چہرے کی دلربا مسکراہٹ، آرام، بچوں سے بھرا گھر اور باعزت بڑھاپا سب کچھ عدم توازن کی بھینٹ

چڑھ گیا ہے۔

تلافی کیسے ہو

عورت اور مرد کی تکمیل اسی صورت میں ہے جب وہ اتنا شعور پالیں کہ ایک دوسرے کو پہلے انسان سمجھیں اور ایک دوسرے کی فطری کمزوریوں کو سمجھ کر ہمدردرویئے اپنا کر انصاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کی کمزوریوں کو بلا تعصب طاقت بنا کر پروان چڑھیں اور ایک ہونے کا عملی مظاہرہ کریں۔ اور کہہ سکیں کہ

"ٹوگیدر وی گرو"۔

رواداری کو عالمی سطح پر تب ہی فروغ مل سکتا ہے جب ایک مرد اور عورت باطن میں جھانک کر اپنے اپنے نرگسی رویوں اور حسد اور رقابت پر قابو پائیں۔ نفسیاتی اور جسمانی کمزوریوں کی بناء پر کمتر جاننے اور غلبے کی بجائے دوست بنیں۔ عورت مرد کا طبعی غصہ اور مرد عورت کی فطری نفسیاتی کمزوریوں کو برداشت کرلے اور بچوں کو بھی ان رواداری کے رویوں کو سکھایا اور سمجھایا جائے۔ تو خاندانوں کی بقا کی امید رکھی جاسکتی ہے۔

تنہائی کا عفریت اور ذہنی امراض

او بجیکشن مائی لارڈ!

انسانی معاشرے کے ان انتہائی رویوں نے خاندان کے ڈھانچے کو گرا کر اس بات کی نفی کر دی ہے کہ "انسان ایک سماجی جانور ہے"

اس ڈھانچے کے ٹوٹنے سے تنہائی کا عفریت انسانوں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ سنگل مدرز یا سنگل فادر کے ساتھ رہتے ہوئے اینٹی سوشل بچے، معاش اور بچوں کی پرورش کے معاملات سے لڑتی ہوئی تنہا عورت، گھروں کے بجھے ہوئے چولھے جہاں سے نہ تو بچوں کو تازہ کھانا مل رہا ہے بلکہ ان چولھوں سے نکلتی ممتا کی محبت بھی ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ بچے ملازمت پر گئی ماں پر ترس کھا کر ڈبہ بند اور فاسٹ فوڈ کے ساتھ غیر صحتمند مشروبات پی کر جہاں جسمانی صحت کھو رہے ہیں وہیں ذہنی صحت بھی چیخ چیخ کر دیوانہ وار انسانی معاشرے کے غیر فطری اور غیر انسانی رویوں کی جانب توجہ دلا رہی ہے۔

می لارڈ! ان انتہا پسند رویوں نے معصوم بچوں سے ان کے خاندان اور گرینڈ پیرنٹس چھین لئے ہیں۔

کیا سب نہیں جانتے کہ انسانی معاشرے کی انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کی بنیادیں پیدا ہونے والے ننھے وجودوں اور مرنے کی طرف رواں دواں بوڑھوں سے جنم لیتی ہیں۔ عمروں کی انتہاؤں کے یہ انسان ایک دوسرے کے ماہر نفسیات اور قدرتی تھیراپسٹ ہوتے ہیں۔ اور ایک محبت آمیز پرواہ کرنے والا بے فکر معاشرہ پنپتا ہے جہاں امن ہی امن ہے۔ مگر اس امن و آشتی کو انسانوں نے ہی تلف کر دیا ہے۔

سُر اور تال

میری ایک بڑبڑاہٹ یہ بھی ہے جو اب ایک احتجاج بن گیا ہے۔

انسانی معاشرے سے فنون لطیفہ اور موسیقی کو ہر ایک کی دسترس سے کیوں دور رکھا جائے۔

می لارڈ! موسیقی، گیت سر نغمہ انتشار کے زہر کا تریاق ہیں۔ یہ تریاق پرشاد کی صورت ملے یہ میری آشا ہے۔

لیکن میں ستار بجانا نہ سیکھ سکی کیونکہ میں اسلامی مملکت کے جرم موسیقی کے ماحول میں ایسے مواقع حاصل نہ کر سکی۔ شاید یہ خلا ابھی تک مجھے

ادھورا رکھے ہوئے ہے۔
اور یہ موسیقی کے تار ہی ہیں جو عدم توازن پر قابو پا کر انسانوں کے ذہنوں کو پر سکون کر سکتے ہیں۔

ہم کون ہیں

اگر ہم جانور نہیں ہیں تو پھر انسان ہیں۔ اور انسان ہیں تو شعور کہاں ہے ؟ شعور ہے تو توازن کہاں ہے ؟
توازن ہے تو سنگدلانہ شدت پسندیاں اور شدت پسندی کی بنیاد پر غیر انسانی رویئے. کیوں ؟
می لارڈ! میری حیرانیوں کی کتاب کا حرف آخر ایک پکار ہے کہ انسان کے معاشرے میں نفرت، حسد، جرم، عدم توازن اور غیر انسانی سلوک کے خاتمے اور محبت، امن اور پیار کے قیام لئے اب تک مذہب، سماجیات، نفسیات اور سائنس نے کوئی دوا اور چارہ گری کیوں نہیں کی ؟۔
می لارڈ! مجھے پھر بھی اچھے کی امید ہے کہ ایک دن کوئی دوا ایجاد ہو ہی جائے گی۔

محبت اور عشق کا نیا فطری ماڈل

کسی بھی مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے عشق کا حق ہونا نفرت کے حق سے بہتر ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہر مرد اور عورت کو دلربائیوں کے لیئے دوستیوں کی کھلی اجازت ہو ایسی دوستیاں اور عشق جو بقائے نسل کے لئے نہیں بلکہ اضافی محبت کے بول کہنے اور سننے کے لئے ہوں۔ اور کتنا اچھا ہو کہ ایک عورت بھی اپنی جاب، گھر، بچے اور گھریلو ذمہ داریاں نمٹا کر کھل کر کہہ سکے کہ اب مجھے اپنے دوست سے ملنا ہے۔ اس سے گھریلو ناچاقیوں کو ریلیف ملے گا۔
دراصل کہنا یہ ہے کہ مرد کو تو روز ازل سے یہ حق ہے لیکن سوال ہے کہ کیوں نہ عورت بھی کھلم کھلا حقدار بن جائے۔
می لارڈ! اس آزادانہ "آئی لو یو" کہنے کا رواج عام ہونے سے گھٹن، فرسٹریشن اور خاندان ٹوٹنے میں بھی کمی ہو گی۔ ایسا میں نے اس لئے کہا کہ ایسا ہو رہا ہے مگر منافقت سے۔ کیوں نہ عشق، فلرٹ اور محبت کے معاملات کو بھی منافقت سے پاک کر کے قانونی حیثیت دی جائے۔ عورتوں کے زہر آلود اور مردوں کے خونخوار رویئے حالت امن میں آسکتے ہیں۔ اور مردوں عورتوں کے شادی کے بعد کے ہسٹیریائی امراض دور ہو سکتے ہیں۔ شادی شدہ عورت کو بھی اس بات کا ڈر نہ ہو کہ اسے کسی نے دوست بنالیا تو ملامت ہو گی اور مرد بھی جھوٹ بول بول کر ہلکان نہ ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کی اضافی خوشیوں کو مل کر منائیں۔

محبت صرف مرد عورت کی کشش پر ہی نہیں کائنات کا ہر مظہر محبت کے سروں پر رقصاں ہے۔ حسین نظارے، نیچر، سکوت، پانیوں کا شور، ماں باپ، بہن بھائی، دوست ہمسائے یہ سب محبت کے طلبگار ہیں۔
کام سے لگن اور کاموں اور فرائض کو نمٹانا بھی محبت ہے اور ان سب محبتوں کو ڈوب کر کرنا عشق اور تکمیل انسانیت ہے۔

کیا شادی کا انسٹیٹیوشن ضروری ہے ؟

ڈیوائن اور یجن تھیوری کے مطابق کائنات خدا نے بنائی، بادشاہ خدا بناتا ہے، خلیفہ خدا بناتا ہے اور جوڑے بھی خدا بناتا ہے۔ تو شادی کا کنٹریکٹ کیوں ؟ کیا یہ فطرت کے خلاف نہیں ؟ جنسی ضرورت کے لئے کرائے کا جج یا مقدس آدمی کیوں ضروری ہیں دو انسانوں کے فطری ملاپ کے لئے ؟

میرے خیال میں تو یہ ڈیوائن اور یجن کی خلاف ورزی ہے۔

دراصل شادی کا کنٹریکٹ سوشل کنٹریکٹ ہے جسے شادی، نکاح، میرج یا بیاہ کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔ اور یہ مکمل طور پر انسانی ادارہ ہے۔ جس کے ذریعہ پیدا ہونے والے بچوں کی پرورش کا ذمہ لینے کے لئے انسانوں کو پابند کیا گیا ہے۔ رہا گناہ ثواب کا معاملہ تو کیا نکاح کے بعد بھی یہ گناہ سرزد نہیں ہوتے ہیں۔؟

می لارڈ! میری تجویز ہے کہ جہاں انسانی تہذیب کے ہر پہلو میں ارتقائی تبدیلیاں آئی ہیں جو انسانوں نے قبول کی ہیں۔ انسانی معاشرے کا ہر ادارہ سوشل کنٹریکٹ ہے تو جنسی ملاپ کو ڈیوینٹی کے حوالے کیوں کیا جائے۔

کیوں نہ اس کو بھی سروس انڈسٹری بنا دیا جائے جس میں شادی کی اہلیت اور بچے پیدا کرنے، اور پرورش کو ایک لازمی فریضہ نہیں بلکہ اختیاری پروفیشن سمجھا جائے۔ جو لوگ بقائے نسل کا شوق رکھتے ہیں انہیں دیگر پیشوں اور ملازمتوں کی طرح اپلائی کر کے اس شعبے میں داخل ہونے کے لئے کٹھن امتحانات سے گزارا جائے۔

شادی کے انسٹیٹیوشن کو مذہب کے سوکالڈ مقدس فریضے سے الگ کر کے سٹیٹ کی نگرانی میں دیا جائے اور بچے وہی لوگ پیدا کریں جو طبعا اور فطرتا نرچرنگ کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس کو فل ٹائم جاب کے طور پر کریں اور اس چائلڈ انڈسٹری کا معاوضہ ریاست سے تنخواہ کی صورت میں ملے۔

بری فطرت کے نرگسی اور بیمار ذہنوں کو شادی اور بچے پیدا کرنے کے لئے نااہل قرار دیا جائے۔ مگر یہ سب شادی کے معاہدے سے پہلے ریاست کے دیکھنے کا کام ہو۔ اور باقی انسانوں کو فری سیکس کی اجازت دے کر آزاد خوشیوں کا حق ملے۔ برے لوگوں کو بچے پیدا کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ورنہ برے والدین کے برے بچے بری ریاست کے قیام عمل میں لائیں گے جو ڈس ایبل ہو گی اور کبھی فلاحی نہیں ہو سکتی۔ شادی اور چائلڈ انڈسٹری کے شعبے میں آنے کے لئے علیحدہ ڈگریاں اور تعلیمی کورسز ہوں اور نفسیاتی ٹیسٹ۔

انسان اور اچھائی

می لارڈ! انسانوں کی اچھائی اور شرافت کو جنسی پاکیزگی، عبادت گاہوں میں حاضری، کسی مذہب سے وابستگی سے جوڑنا عقل سے بالا ہے۔ اور یہ سب قدغنیں اور جنسی پاکیزگی کے مطالبے صرف عورت سے ہی کیوں۔؟

میری نظر میں ہر وہ انسان مرد عورت اور خواہ کسی بھی جنس کا ہو وہ اچھا کہلانے کا مستحق ہے جو اپنی زندگی کی ذمہ داریوں کو دیانت داری، عشق اور کامل سچائی کے ساتھ خلوص اور انہماک کے ساتھ کرتا ہے۔ کارہائے زندگی ہی انسانی معاشرے کا خاصہ ہیں۔ ایسے کام جو اس کی ذات سے شروع ہو کر پوری انسانیت کے نفع کا باعث ہوں۔

نافع الناس ہی اچھے انسان ہیں۔

اس سے قبل کہ آرٹیفشل دماغ اور مشینیں نسل انسانی ختم کر دیں یا بے روح مشینیں بے دلی سے ہماری غمگسار بنیں، اور محبت کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے اور محبت ادب اور عجائب خانوں میں قدیم انسانوں کا قدیم جذبہ بن جائے یا عورت اور مرد اچھے انسان تو کیا بے وجود ہی ہو جائیں۔

اے خاک کے انسان!

کوئی اشرف کالونی بنا اور اشرف المخلوقات بن۔ زمین کے بکھیڑے نبیڑ؛ نہ کہ آسمان کی خیالی وسعتوں میں حل تلاش کر۔ اور انسان دوستی کے

ساتھ بقائے انسانیت اور امن کو ممکن بنا جو بے کار کے قضیوں میں الجھی ہے۔ یہ چارہ گری تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ جعلی آقاؤں کی قدم بوسی کے بجائے دکھی انسانوں کے قدموں میں بیٹھ تجھے آشنا ملے گا۔